طاہر جاوید مغل

برق رفتار

اس کے لمبے بال کندھوں سے تھوڑے ہی اوپر تھے۔ درمیانہ قد اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا، عمر پچیس چھبیس سال ہوگی۔ نام تو اس کا جمشید تھا لیکن یار لوگ اسے ارشمیدس کے وزن پر جمشیدس کہتے تھے۔ وہ خاصا پڑھا لکھا تھا۔ فزکس اور کیمسٹری میں ایم ایس سی کر رکھا تھا۔ کیمسٹری خاص طور سے اس کی دلچسپی کا میدان تھا۔ اس کا چھوٹا سا فلیٹ کسی سائنس لیب کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

جمشیدس پچھلے تین سال سے اس فلیٹ میں مقیم تھا۔ اس کے والدین کسی چھوٹے شہر کے رہنے والے تھے اور وہ ان سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ آبائی مکان سے حصے کے طور پر اسے بھائیوں سے کافی رقم ملی تھی۔ یہ رقم لاہور کے ایک بینک میں جمع تھی۔ اس کے منافع سے جمشیدس کی گزر بسر کشایش سے ہو رہی تھی۔ پورے لاہور میں اس کے فقط دو تین ہی دوست تھے۔ ان میں سے ایک کا نام سالک تھا اور وہ اس وقت جمشیدس کے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ سالک بھی جمشیدس کی طرح یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔

جمشیدس کے چہرے پر بے پناہ مسرت نظر آ رہی تھی۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی ہلکی بھوری آنکھیں چمک

رہی تھیں۔ آج اس کی فتح کا دن تھا۔ بالآخر اسے وہ کامیابی مل گئی تھی جس کے لیے وہ تقریباً چار سال سے اپنی جان سخت جوکھم میں ڈالے ہوئے تھا..... اس نے آخر اسراع انگیز محلول تیار کرلیا تھا۔ جس کا نام اس نے اپنی محبوبہ فرح کے نام کی نسبت سے ''ایف ٹو'' رکھا تھا۔ اب ایف ٹو یکسر تیار تھا اور شیشے کے دو چمکدار گلاسوں میں ان کے سامنے میز پر رکھا تھا۔ دیکھنے میں یہ بالکل شراب جیسا نظر آتا تھا اور اس کے اجزاء میں بھی شراب کے کچھ اجزاء شامل تھے۔ لیکن یہ شراب، طاقت بخش میڈیسن یا اس قسم کی دوسری اشیاء سے بہت آگے کی چیز تھا۔ بے شک اس میں الکحل خاص جوہری شکل میں پایا جاتا تھا اور محلول میں اس کی بو بھی نمایاں تھی لیکن الکحل تو اس محلول کا ایک ثانوی جزو تھا۔ یہ مشروب حیرت انگیز اجزاء کا بے مثال مرکب تھا اور جمشید س کو یقین تھا کہ اس کی یہ ایجاد عنقریب سائنسی دنیا میں انقلاب برپا کرنے والی ہے۔

جمشید س نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور سالک سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''چل یار شروع کرو۔''

محلول ایف ٹو کے حوالے سے لمبی بحث کے باوجود جمشید س کا لنگوٹیا سالک ابھی تک گھبرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ دیکھ کر جمشید س نے کہا ''اب کیا ہے میرے باپ؟''

سالک بولا ''ایک بات بالکل سچی سچی بتا جمشید س! اس سے پہلے تم نے کتنی بار ٹرائی کیا ہے اسے؟'' سالک کا اشارہ گلاس میں ہلکورے لیتے عجیب و غریب محلول کی طرف تھا۔

''کم از کم پانچ بار۔ صرف پہلی بار سر میں تھوڑی سی گرانی محسوس ہوئی اور وہ بھی تب جب اس کا اثر ختم ہو چکا تھا۔ ایک دو ابکائیاں آئیں لیکن پھر میں کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ دو گھنٹے بعد اٹھا تو طبیعت بالکل بحال تھی۔ اس کے بعد بھی کچھ نہیں ہوا۔ بس بعد میں غنودگی محسوس ہوتی تھی، بالکل جیسے وہسکی کا نشہ اترنے کے بعد ہوتی ہے۔ ایک دو گھنٹے کے لیے سو لیتا تھا۔ ایک دم فریش ہو جاتا تھا۔''

''ان تجربوں کے دوران میں کبھی خون، پیشاب وغیرہ ٹیسٹ کروایا؟'' سالک نے پوچھا۔

''تو زیادہ حکیم لقمان نہ بن۔ ان معاملوں کو تو مجھ سے زیادہ نہیں سمجھتا ہے۔ میں نے کوئی گوشہ اندھیرے میں نہیں رہنے دیا..... اور یار! تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔'' جمشید س ایکدم بھڑک کر بولا ''تو اکیلا تو نہیں پی رہا۔ میں تیرے ساتھ پی رہا ہوں۔ اور مجھے اپنی جان بہت پیاری ہے۔''

''ہاں ہاں۔ سائنٹسٹ کی جان ہے، میرے جیسے کی جان تھوڑی ہے۔'' سالک نے کہا۔

''اچھا اچھا، زیادہ باتیں نہ بنا۔ چل گلاس..... چیئرز۔''

دونوں نے گلاس اٹھالیے۔ یہ دوپہر کا وقت دوسری منزل کے اس فلیٹ کی بیرونی کھڑکی کھلی تھی اور سڑ کا مدھم شور سنائی دے رہا تھا۔ جس کمرے میں دونوں دو بیٹھے تھے، وہ ابتری کی مثال تھا۔ ہر طرف کاغذات، کتا اور سی ڈیز وغیرہ بکھری تھیں۔ ساتھ کے دونوں کمروں مختلف کیمیکلز اور ادویات کی بو بھاپ کی طرح اٹھ رہی تھی

جمشید س بولا ''ڈگری کورس کی کتاب میں شا اسٹوری پڑھی تھی W E ACCELERATOR۔ اس وقت کیا پتا تھا کہ دن میں اور تم بھی اس میں موجود کے دو کرداروں کی ایک تہلکہ خیز محلول کے گلاس ہاتھوں میں لیے بیٹھے گے۔''

''اللہ کرے ہمارا انجام بھی اس شاٹ اسٹوری کرداروں کی طرح بخیریت ہو۔''

''بے فکر رہو۔ بخیریت ہوگا بلکہ بہت..... بہت ہوگا۔'' جمشید س نے جوش سے کہا۔

دونوں دوست محلول پینے کے لیے بالکل تیار تھے۔

جمشید س نے کہا ''اچھا..... میں ضروری باتیں ایک پھر دہرا دوں..... ایف ٹو ہمارے معدوں میں پہنچنے کے چھ منٹ بعد کام کرنا شروع کردے گا۔ پینے کے بعد ہم چھ منٹ تک بالکل بے حس و حرکت بیٹھیں گے، آنکھیں رکھیں گے۔ اس کے بعد پہلے میں آنکھیں کھولوں گا پھر کھولنے کے لیے کہوں گا۔ اب تک یہ بات اچھی تمہاری سمجھ میں آچکی ہوگی کہ ایف ٹو اثر پذیر ہونے کے ہمارے جسم کے سارے سسٹمز کو کئی گنا تیز کردے گا۔ میں جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کے سسٹمز شامل ہیں۔ سارے نظام تیز رفتار ہو جائیں گے تو وقت کی رفتار بھی ہوجائے گی۔ مثال کے طور پر یہ ڈرنک پینے کے بعد ہم پانچ چھ گھنٹے گزاریں گے، وہ ہمارے اردگرد کے لوگوں لیے بمشکل 30 منٹ ہوں گے۔ یعنی ہماری رفتار اپنے قر و جوار کے عمومی رفتار سے قریباً بارہ گنا زیادہ ہوگی۔ اور تھو سی اضافی توانائی خرچ کرکے ہم اس رفتار کو مزید بڑھا ہیں۔ مثلاً اگر تم دس میل فی گھنٹا کی رفتار سے بھاگ سکتے

اس ڈرنک کے اثر پذیر ہونے کے بعد تم 120 میل فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑ سکو گے اور اضافی طاقت لگا کر یہ رفتار ایک سو پچاس یا ساٹھ تک بڑھا سکو گے۔ یہی صورت حال باقی ساری حرکات وسکنات اور ذہنی افعال کی ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہوناں؟''

سالک نے اثبات میں سرہلایا اور اندرونی اضطراب کو چھپانے کے لیے میز پر بائیں ہاتھ سے طبلہ بجایا۔ یہ سب کچھ اس کی عقل سمجھ سے بالاتر تھا۔

''اب یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ عام لوگوں کو چونکائے بغیر ہمیں ان کے درمیان گھومنے پھرنے کے لیے اپنی حرکات وسکنات کو کنٹرول میں رکھنا ہوگا اور سست کرنا ہوگا۔ مثلاً اگر ہم سڑک پر نکل کر تیز چلیں گے تو دیکھنے والے بوکھلے رہ جائیں گے۔ لہٰذا ہمیں اپنی رفتار کو بہت سست رکھنا ہوگا۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ ہم پیدل چلنے سے گریز کریں۔ دیگر حرکات مثلاً اٹھنا، بیٹھنا، مصافحہ کرنا، کھانا پینا یہ سب کچھ میری ہدایت کے مطابق کرو گے تو کم سے کم لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں گے...... سمجھ رہے ہوناں؟''

''بالکل سمجھ رہا ہوں عالی جاہ۔'' سالک نے کہا پھر جمشید کی تسلی کے لیے اس کی ہدایت کے مطابق اٹھ کر بیٹھ کر، جیب سے اپنا رومال نکال کر اور عینک جیب میں ڈال کر بتایا۔ یہ ساری حرکات اس نے بالکل سلوموشن کے انداز میں کیں۔

''آخری ہدایت پھر دہرا دوں۔'' جمشید نے کہا ''ڈرنک لینے کے بعد ہم نے کسی دوسرے شخص کو مخاطب نہیں کرنا۔ آپس میں بھی اتنی آواز سے نہیں بولنا کہ ہماری باتیں کسی دوسرے کے کانوں تک پہنچیں۔ ہماری آواز کی فریکوئنسی اور بولنے کی رفتار بھی تبدیل ہوچکی ہوگی۔ لوگوں کے کانوں تک ہماری آواز ویسے ہی پہنچے گی جیسے ٹیپ ریکارڈ کے تیز والیم سے پہنچتی ہے۔'' سالک نے ایک بار پھر اثبات میں سرہلایا۔

دونوں نے گلاس اٹھائے، انہیں ایک دوسرے سے ٹکرایا اور پھر ایک ہی سانس میں آنکھیں بند کرکے چڑھا گئے۔ تیز اثر تلخ محلول نے گلے سے لے کر پیٹ تک جیسے آگ سی لگادی۔ کچھ دیر تک شدید جلن رہی پھر یہ جلن دھیرے دھیرے پورے جسم میں پھیل گئی۔ پھیلنے سے اس کی شدت قدرے کم ہوگئی۔ وہ اپنی پلاننگ کے مطابق ساکت بیٹھے رہے۔ ان کے مساموں سے پسینا نکلتا رہا۔ کمرے کا ٹمپریچر جیسے ایک دم کئی گنا بڑھ گیا تھا۔

کافی دیر بعد پہلے جمشید اور پھر سالک نے آنکھیں کھول دیں۔ سالک کی نگاہ سب سے پہلے دیوار پر لگے ''بریکٹ فین'' پر پڑی۔ پنکھے کے پر آہستگی سے گھوم رہے تھے۔ جمشید نے ہاتھ میں پکڑا گلاس ہوا میں اچھالا۔ سالک دنگ رہ گیا۔ ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ گلاس ہوا میں معلق تھا اور بہت آہستہ آہستہ نیچے آرہا تھا۔ اس میں سے گرنے والے سنہری محلول کے چند قطرے بھی ہوا میں معلق تھے۔ جمشید نے مسکراتی نظروں سے گلاس اور قطروں کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ گلاس فرش پر گر کر چکنا چور ہوتا جمشید نے بڑے آرام سے اسے دوبارہ ہاتھ کی گرفت میں لے لیا...... اور بڑے دھیرج سے دوبارہ تپائی پر رکھ دیا۔ وہ دونوں اپنے جسموں میں امنگ ترنگ اور توانائی کا ایک سمندر ہلکورے لیتا محسوس کررہے تھے۔ خاص طور سے سالک کے تو

روئنگٹے کھڑے ہوگئے۔

''یہ آوازیں کیسی ہیں؟'' سالک نے دھیمے لہجے میں جمشیدس کو مخاطب کیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ غالباً سڑک سے آرہی ہیں یہ آوازیں۔''

''یہ ٹریفک کی آوازیں ہی ہیں۔ لیکن ہمارے لیے اب ناقابلِ شناخت ہوگئی ہیں۔ یہ لمبی بھاری آواز کار کے باریک ہارن کی ہے۔ یہ دوسری نمایاں آواز ٹو اسٹروک رکشا کی ہے۔ سمجھو کہ یہ آوازیں ایک آڈیو کیسٹ پر ہیں اور آڈیو کیسٹ معمول سے دس بارہ گنا کم رفتار سے چل رہی ہے۔''

''اوہ مائی گاڈ۔'' سالک نے ہونٹ سکوڑے۔

کار کے ہارن کی عجیب وغریب آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی اور بہت پاس سے آرہی تھی۔

سالک نے پوچھا۔ ''یہ کار تو شاید نیچے کھڑی ہے۔''

جمشیدس نے غصے سے ہونٹ پھر سکوڑے ''مالک مکان ہے اپنا۔ ایک نمبر کا جاہل رات ہو یا دن اسی طرح ہارن پر ہاتھ رکھ کے بھول جاتا ہے۔ مردے بھی قبروں سے جاگ جاتے ہیں۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''چلو آج سب سے پہلے اسی کی خبر لیتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''بتاتا ہوں تمہیں۔ اور زیادہ سوال مت پوچھنا۔ بس دیکھتے جانا کیا کرتا ہوں۔ جہاں کہیں تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی تمہیں پکارلوں گا۔''

''لیکن یار! کوئی غلط سلط کام نہیں ہونا چاہیے۔''

''دنیا میں کوئی کام غلط نہیں ہوتا اور نہ کوئی صحیح ہوتا ہے۔ غلط وہی ہوتا ہے جسے غلط ثابت کیا جاسکے اور صحیح وہی ہے جسے صحیح ثابت کیا جاسکے۔ مطلب یہ کہ اصل چیز ثابت کرنے کی طاقت ہے...... چل اب چھوڑ اس بحث کو۔ فلسفے میں پڑ کر ٹائم ضائع ہوگا۔ اور آج ہمارا ٹائم بہت قیمتی ہے۔ آج ہم اس دنیا کو ایک نئے ڈھنگ سے دیکھنے والے ہیں۔''

سالک نے کھڑکی کی طرف جانا چاہا۔ شاید وہ نیچے جھانکنا چاہتا تھا۔ جمشیدس نے اسے منع کردیا۔ ''نہیں پیارے! ایسے مزہ نہیں آئے گا۔ یہ تماشا قریب سے دیکھیں گے۔''

اپنے اپنے ہیلمٹ پکڑ کر وہ دونوں فلیٹ سے باہر آگئے۔ نیچے اترنے کے لیے انہوں نے عقبی زینہ استعمال کیا۔ یہ اکثر ویران پڑا رہتا تھا، آج بھی ویران تھا۔ سالک نے ایک چوہے کو اپنے سامنے سے گزرتے دیکھا۔ وہ حیران کن سست رفتاری سے گزرا تھا۔ سالک کو اس کی گول آنکھیں، اس کی لہراتی دم اور پنجوں کے ناخن تک صاف دکھائی دیے۔ اسے لگا کہ وہ اسے بہ آسانی گردن سے دبوچ سکتا ہے۔

ایف ٹو کے کرشماتی اثر کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ دونوں بلڈنگ کے نیم تاریک گیراج میں پہنچے یہاں وہ ہارس پاور والی جاپانی موٹر سائیکل موجود تھی جو سالک نے کل اپنے ایک دوست سے مستعار لی تھی۔ آج وہ ہیلمٹ پہن کر اسی موٹر سائیکل پر لاہور شہر کی سیر کرنے والے تھے۔ ناقابلِ یقین حد تک انوکھی سیر۔ موٹر سائیکل کی نمبر پلیٹ فرضی تھی۔

مالک مکان کی ٹویوٹا کار گیراج میں پہنچ چکی تھی۔ سالک نے بونٹ پر ہاتھ تو رکھا، وہ گرم تھا۔ مالک غالباً ذرا دیر پہلے ہی یہاں سے نکلا تھا۔ جمشیدس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ اتفاقاً دروازہ کھلا تھا۔ وہ اندر گھس گیا۔ اسٹیئرنگ پر ہارن کو پریس کرنے والا پینل موجود تھا۔ جمشیدس نے اسے بہ آسانی خالی ہاتھوں سے اکھاڑ لیا۔ اس کے تار کھینچ کر توڑ دیے اور پینل توڑ موڑ کر ڈیش بورڈ میں گھسا دیا۔

سالک کو اس بات کا ثبوت مل رہا تھا کہ رفتار کے ساتھ ساتھ ان کی جسمانی طاقت میں بھی کئی گنا اضافہ ہوچکا ہے۔

ہارن کی خبر لینے کے بعد جمشیدس کا دھیان ڈیک کی طرف چلا گیا۔ ''ہارن کی طرح یہ بھی بہت طوفان مچاتا ہے۔'' جمشیدس بڑبڑایا۔ اس نے ایک زوردار جھٹکے سے قیمتی کنسول بکس اکھاڑ دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈیک کا تیاپانچا کر ڈالا۔ پلک جھپکتے میں جمشیدس کے نالائق مالک مکان کو دس پندرہ ہزار کا ٹیکا لگ چکا تھا۔

گاڑی کو پھر سے احتیاط کے ساتھ بند کرنے کے بعد انہوں نے موٹر سائیکل نکالی اور گیرج سے باہر آگئے۔ تاریک شیشوں والے ہیلمٹ ان کے سروں پر تھے۔ اس تاریک شیشے کے پیچھے سے سالک نے سڑک کا نظارہ کیا اور دم بخود رہ گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہوا۔ اس کے سامنے لاہور کی مصروف سڑک فیروز پور روڈ تھی۔ اسے لگا جیسے وہ حقیقت میں اس سڑک کو نہیں دیکھ رہا بلکہ یہ کسی فلم کا سین ہے...... یا پھر جاگتی آنکھوں کا خواب ہے۔ تمام ٹریفک جیسے جامد سا ہوگیا تھا۔ وہ بے حد سست روی سے حرکت کررہا تھا۔ بعض سواریاں تو یوں لگ رہا تھا کہ حرکت کر ہی نہیں رہیں۔ ایک نہایت سست رفتار کار کے سامنے سے ایک بچہ بھاگ کر سڑک عبور کررہا تھا، اس کے دونوں پاؤں ہوا میں تھے اور

اسکول بیگ بھی معلق تھا۔ ایک سائیکل والا لہرا کر بغلی گلی میں مڑ رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی سست روی کے سبب ابھی پہلو کے بل گر جائے گا۔ تین موٹر رکشا متوازی جا رہے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے کسی کو بھی اوورٹیک کرنے کی جلدی نہیں ہے۔ سڑک کے کنارے کھڑے دو افراد منہ کھول کر ہنس رہے تھے، ان کے گلے کے اندر سرخ سرخ تالو اور کوے تک سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایک نے دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارنے کے لیے اپنا ہاتھ فضا میں اٹھا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا اس ہاتھ کو منزل تک پہنچتے پہنچتے کئی منٹ لگ جائیں گے۔

وہ دونوں موٹر سائیکل پر بیٹھے تھے۔ موٹر سائیکل ابھی اسٹارٹ نہیں ہوئی تھی۔

جمشید س نے سرگوشی کی۔ ”میں نے تمہیں دس بارہ گنا زیادہ رفتار کا بتایا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس وقت ہماری رفتار اس سے بھی زیادہ ہے۔ شاید بیس پچیس گنا زیادہ...... تم اس سامنے والی کار کے اندر دیکھو اسپیڈ میٹر تقریباً چالیس میل کی رفتار بتا رہا ہے۔ اور یہ بیل گاڑی سے بھی سست جا رہی ہے؟“

”ارے ارے وہ دیکھو۔“ سالک تقریباً چلا اٹھا۔

”کیا کرتے ہو یار۔ تمہیں بتایا ہے آہستہ بولنا ہے۔“ جمشید س نے اسے سرگوشی میں جھاڑا۔ پھر اس نے سالک کی نظروں کا تعاقب کیا۔ اسے ایک ویگن سے اترتے لڑکے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا...... لڑکے کا ایک پاؤں ویگن کے فرش پر تھا اور دوسرا آہستہ آہستہ سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس سے دو فٹ آگے ایک بزرگ تھے۔

”کیا دیکھا تم نے؟“ جمشید س نے سرگوشی کی۔

”اس لڑکے نے بابا جی کی جیب سے کچھ نکالا ہے...... وہ دیکھو اب اپنی پینٹ کی جیب میں ڈال رہا ہے۔ لگتا ہے بٹوا ہے......“ سالک کے لہجے میں اضطراب تھا۔ غالباً وہ چاہ رہا تھا کہ لڑکے کو جا پکڑے۔

جمشید س نے تیز سرگوشی کی۔ ”ہمیں کسی ایسے ویسے پنگے میں نہیں پڑنا۔ بس دیکھتے جاؤ، بولنا کچھ نہیں۔“

ان دونوں نے صاف دیکھا۔ ویگن کے کنڈیکٹر نے جیب کترے کی طرف ایک شناسا مسکراہٹ اچھالی۔ وہ دونوں شاید ”پارٹنر“ تھے۔

اپنے اردگرد کی سست رو زندگی کا مشاہدہ ان دونوں کے لیے اتنا دل آویز اور حیرت ناک تھا کہ وہ کئی منٹ تک وہاں کھڑے رہے۔ پچھلے تقریباً دو منٹ سے کالج کی دو لڑکیاں مکئی کے بھٹے کھاتی ہوئی ان کے پاس سے گزر رہی تھیں۔ ایک لڑکی بھٹا اپنے منہ کی طرف بڑھا رہی تھی اس کے منہ میں چمکتا ہوا لعاب دہن تک نظر آ رہا تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی کا یہ انداز کچھ زیادہ خوبصورت نہیں تھا......

ان دونوں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور یونیورسٹی کے نیو کیمپس کی طرف بڑھنے لگے۔ موٹر سائیکل کی رفتار بے حد سست تھی۔ لگتا تھا کہ جمشید س سست ترین موٹر سائیکل چلانے کے مقابلے میں حصہ لے رہا ہے۔ مگر جمشید س نے سالک کو بتایا کہ رفتار اب بھی تیس چالیس کے درمیان ہے۔

”اب کہاں جاؤ گے؟“ سالک نے اس کے کان میں پوچھا۔

”تمہارا کیا اندازہ ہے؟“

”میرا تو خیال ہے کہ اپنی جان جگر فرح کی طرف۔ اسے متاثر کرنے بلکہ اس کے ہوش حواس گم کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے۔ طوطے کبوتر اڑ جائیں گے محترمہ کے۔“

”نہیں یار! وہ تو...... وہ تو گھڑے کی مچھلی ہے۔ جب چاہیں گے متاثر کر لیں گے۔ آج تو کچھ نیا دیکھتے ہیں۔ نیا کرتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”فزکس ڈپارٹمنٹ کے ڈان لمبو کی طرف چلتے ہیں۔“

”ڈ...... ڈان لمبو کی طرف...... کیوں؟“

”اوئے کھوتے! مجھ سے پوچھتا ہے کیوں؟ اس نے تیری گرل فرینڈ پر چھاپا مارا ہے یا نہیں؟ اتنی ڈیسنٹ لڑکی کو لے اڑا۔ اب وہ تیرے سامنے اس کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر پھرتی ہے۔ اس سینہ زوری کا بدلہ نہیں لینا تو نے؟“

”او نہیں یار! مٹی ڈالو اس معاملے پر۔ میں بھی بھول چکا ہوں۔ وہ تھی ہی ایسی۔ اگر وفادار ہوتی تو پھر ڈان لمبو چھوڑ کوئی بھی آ جاتا، وہ میرے ساتھ ہی رہتی۔“

”جانتا ہوں...... سب جانتا ہوں۔ خود کو جھوٹی تسلی دیتے ہو۔ چلو تسلی ہی سہی لیکن اس خبیث کو تھوڑا سبق ضرور ملنا چاہیے۔ اس کی گردن کا سریا سخت ہوتا جا رہا ہے۔“

سالک کے منع کرنے کے باوجود جمشید س نیو کیمپس جا پہنچا۔ انہوں نے موٹر سائیکل دور درختوں میں کھڑی کی اور اس اندرونی سڑک پر پہنچ گئے جہاں سے ڈان لمبو کے گزرنے کی توقع تھی۔ جمشید س کی ہدایت پر سالک نے بھی اپنے نئے نکور ہیلمٹ کا تسمہ خوب کس کر باندھ لیا تھا۔ ان ہیلمٹس اور ان نئے کپڑوں میں ان دونوں کا پہچانے جانا بہت مشکل تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں ڈان لمبو سڑک کے کنارے کھڑا مل گیا۔

ایک دوست اس کے پہلو میں تھا اور وہ ایک لڑکی سے ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے۔ یونیورسٹی میں بلکہ کئی اور تعلیمی اداروں میں بھی ڈان کی دھاک تھی۔ وہ لڑائی بھڑائی میں یکتا تھا۔ اکثر اسلحہ بھی پاس رکھتا تھا۔

تاہم ان لمحوں میں ڈان ان دونوں کو کیچوا نظر آیا۔ جمشید س نے جاتے ہی اس کا گریباں پکڑا اور ایک درخت سے دے مارا۔ لڑکی نے چلانے کے لیے منہ کھولا...... اور مڑ کر واپس بھاگی لیکن وہ بھاگی تو تب جب پوری طرح مڑتی۔ لگتا تھا کہ اس کے مڑنے میں ہی پندرہ بیس سیکنڈ لگ جائیں گے۔ درخت سے ٹکرانے کے بعد ڈان بے پناہ پھرتی سے جمشید س کی طرف آیا لیکن اس کی یہ بے پناہ پھرتی مضحکہ خیز تھی۔ وہ دونوں اطمینان سے اسے دیکھ رہے تھے اور وہ ان کی طرف چھ سات فٹ کا درمیانی فاصلہ طے کررہا تھا۔ طیش کے ساتھ ساتھ ڈان کے چہرے پر بے حد حیرت بھی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ آہستہ آہستہ بند ہوکر مکے کی شکل اختیار کررہا تھا لیکن پورا مکہ بننے میں ابھی خاصی دیر تھی۔ جمشید س نے اس کے قریب پہنچنے کا انتظار کیا اور پھر ایک طرف ہٹ کر ایک زوردار جھانپڑ ڈان کی گردن پر مارا، وہ سلوموشن کے انداز میں قلابازی کھاتا ہوا پتھر یلے بینچ کی طرف گیا۔ دوسرا لڑکا اپنی پتلون سے موٹے بکل والی بیلٹ کھینچنے کی کوشش کررہا تھا۔ پچھلے نصف منٹ میں وہ بس ایک چوتھائی بیلٹ ہی کھینچ سکا تھا۔ سالک نے اپنے دبلے پتلے ہاتھوں سے اس کا ہک کھول کر پتلون نیچے گرادی۔ اور زوردار لات مار کر اسے کئی میٹر پیچھے پھینک دیا۔ دو اور لڑکے سلوموشن میں بھاگتے ہوئے ان کی طرف آرہے تھے...... ایک کے ہاتھ میں چاقو بھی تھا۔ لیکن لڑکوں کی حرکات اتنی سست تھیں کہ یہ چاقو انہیں بالکل بے ضرر لگا۔ اگلے ایک دو منٹ میں ان دونوں نے ڈان اور اس کے تین ساتھیوں کو دھن کر رکھ دیا۔ ان میں سے دو کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور ڈان لہو کے کئی دانت اس کے حلق میں جا گرے...... وہ ذبح ہوتے بکرے کی طرح چلانے لگا۔

جمشید س اور سالک پہلے درختوں میں روپوش ہوئے پھر موٹر سائیکل پر سوار ہوکر اقبال ٹاؤن کی طرف نکل گئے۔ ڈان کے ساتھی سے چھینا جانے والا چاقو اب جمشید س کی جیب میں تھا۔

''اب کہاں؟'' سالک نے ذرا لطف لیتے ہوئے کہا۔

''اس خبیث ڈائریکٹر کی طرف جس نے نوکری نہیں دی تھی اور بے عزت کرکے دفتر سے نکالا تھا۔''

''تمہارا مطلب شاہین فارماسوٹیکل......''

جمشید س نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''حرامی کی گنجی کھوپڑی پر آج طبلہ نہ بجایا تو میرا نام نہیں۔''

''یار چھوڑو۔ کیوں گڑے مردے اکھاڑ رہے ہو۔ یہ سال بھر پرانی بات ہے۔ اور پھر اس کو تم سے کوئی دشمنی تھوڑی تھی۔''

''بات دشمنی دوستی کی نہیں...... رویے کی ہوتی ہے اور ڈائریکٹر تنویر جیسے لوگ سونے کی کرسی پر بیٹھ کر انسانوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح سمجھنے لگتے ہیں۔''

وہ اب مصروف شاہراہ ملتان روڈ پر تھے۔ موٹر سائیکل کی رفتار 120 میل فی گھنٹا تھی۔ اس مصروف سڑک پر طوفانی رفتار سے موٹر سائیکل چلاتے انہیں دقت نہیں ہورہی تھی۔ ان کے اردگرد موجود ٹریفک جیسے منجمد سا ہوگیا تھا۔ بس زیادہ تیز رفتار گاڑیوں میں ہی معمولی سی حرکت دکھائی دیتی تھی۔ پیدل چلنے والے، گدھا گاڑیاں اور سائیکل سوار تو جیسے ساکت ہی تھے۔ صرف برقی رفتار ویگنوں اور رکشاؤں وغیرہ میں حرکت دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ایک حنوط شدہ شہر کے درمیان سے گزر رہے ہیں۔ ناقابل شناخت آوازوں کی گونج اس پر مستزاد تھی۔ ایک ٹریفک سگنل کاٹنے پر ہیڈ کانسٹیبل نے انہیں کڑے تیوروں سے دیکھا۔ اس نے اگلے موڑ پر کھڑے کانسٹیبل کو خبردار کرنے کے لیے وسل کو ہونٹوں کی طرف لے جانا چاہا۔ لیکن ابھی وصل اور ہونٹوں کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔ یہ فاصلہ ختم ہونے تک تو وہ دونوں دو کلومیٹر آگے جاسکتے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے جمشید س نے بڑے آرام سے وسل ہیڈ کانسٹیبل کی انگلیوں سے نکالی اور اس کی ناک کے دائیں نتھنے میں اڑس دی۔

بس دو تین منٹ بعد وہ دونوں شاہین فارماسوٹیکل فیکٹری کی عقبی دیوار پھلانگ کر ڈائریکٹر تنویر کے وسیع عریض آفس میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں تک آتے انہیں صرف تین افراد ملے تھے۔ ایک قاصد نما شخص تھا جو چند کاغذات لیے برآمدے سے گزر رہا تھا۔ اس نے جمشید س اور سالک کو دوڑ کر ایک کوریڈور میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ یقیناً اسے ایسا ہی لگا ہوگا کہ دو بگولے اس کے سامنے سے گزر کر کوریڈور میں گھس گئے ہیں۔

عین ممکن تھا کہ وہ ان کے کپڑوں کے رنگ بھی درست طور پر نہ دیکھ سکا ہو۔ دوسرا شخص کرسی پر اونگھتا ہوا کمپیوٹر آپریٹر تھا۔ اس نے بھی شاید اسے اپنی آنکھوں کا دھوکا سمجھا

نمبرا شخص ڈائریکٹر کے آفس کے سامنے پہرا دینے والا ہٹا کٹا مسلح گارڈ تھا۔ رائفل کے دستے پر اس کا ہاتھ تھا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ ابھی اس بات میں بہت دیر تھی کہ وہ صورتِ حال کو پوری طرح سمجھتا...... ان دونوں سے کچھ پوچھتا...... یا رائفل کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتا۔ جمشیدس اس کی گردن اپنے بازو میں جکڑ کر آفس کے اندر لے گیا۔ آفس میں ڈائریکٹر تنویر صاحب لنچ میں مصروف تھے۔ لقمہ ان کے ہاتھ میں تھا اور ہاتھ بہت آہستہ آہستہ ان کے ہونٹوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی گردن دروازے کی طرف بھی موڑ رہے تھے۔ اپنے تنومند گارڈ کو چھپکلی کی طرح ایک ہیلمٹ پوش کے شکنجے میں دیکھ کر ان کے چوڑے چکلے چہرے پر حیرت امنڈنا شروع ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی یہ تاثر بھی اپنے کلائمکس پر نہیں پہنچا تھا۔

جمشیدس نے تنومند گارڈ کا سر ایک پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ وہ بے ہوش یا نیم بے ہوش ہو کر فرش کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب تک گارڈ کا جسم فرش سے ٹکراتا جمشیدس مٹن قورمے کی پلیٹ ڈائریکٹر صاحب کے چہرے پر الٹ چکا تھا۔ مرچوں سے ڈائریکٹر صاحب کی آنکھیں بھر گئیں۔ وہ اپنے کھلے منہ سے عجیب قسم کی آواز نکال رہے تھے۔ جیسے گراموفون کی چابی ختم ہونے پر ''ریکارڈ'' گدھے کی طرح رینگنا شروع کر دیتا ہے۔ یقیناً وہ اپنے ملازمین کو مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ جمشیدس نے ڈائریکٹر کی امپورٹڈ پی کیپ اتار کر اس کے سر پر تیزی سے چپت لگائی...۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈائریکٹر صاحب کی صفاچٹ کھوپڑی سرخ انگارا ہو گئی۔ اس نے پھرتی سے ان کا تھری پیس سوٹ پھاڑ ڈالا...... ان کے جسم پر فقط ایک سفید انڈرویئر رہ گیا۔ ان کی ٹائی کا ایک سرا جمشیدس نے ان کے ٹخنے سے باندھا اور سالک کے ساتھ مل کر شاہین فارماسوٹیکل کے کرتا دھرتا کو چھت کے پنکھے سے الٹا لٹکا دیا۔ ڈائریکٹر کے تاثرات دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ لگتا تھا کہ دہشت سے موصوف کو ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔ جمشیدس نے نیم بے ہوش گارڈ پر تھوکا۔ ''اس حرامی نے مجھے دھکے دیے تھے۔''

یہ سارا واقعہ جمشیدس اور سالک کے وقت کے مطابق چھ سات منٹ میں ہوا تھا لیکن درحقیقت اس میں 30 سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ جب آفس کے مقفل دروازے پر باہر سے پہلی ڈری ڈری دستک کی گونج ابھری، اس وقت وہ دونوں عقبی دروازے سے باہر نکل رہے تھے...... جمشیدس کی بغل میں دفتر کی کئی اہم فائلیں دبی ہوئی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد انہوں نے یہ فائلیں فیکٹری کے عقب میں واقع گندے نالے میں پھینک دیں...... اور اپنی موٹر سائیکل کا رخ گلشن اقبال کی طرف کر لیا۔ ہیلمٹ بدستور ان کے سروں پر تھے۔

''اب کہاں کا ارادہ ہے؟'' سالک نے پوچھا۔

''تم GUESS کرو۔''

''سمجھ گیا۔ مشٹنڈوں کی ٹولی کی طرف۔''

''اس دفعہ ٹھیک سمجھے ہو۔'' جمشیدس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اس دفعہ میں بھی ''ایگری'' ہوں''۔ سالک نے کہا۔

جنہیں وہ دونوں مشٹنڈوں کی ٹولی کہہ رہے تھے، وہ دراصل جمشیدس کے محلے دار لڑکے ہی تھے۔ جمشیدس کے فلیٹ کے ساتھ والی لین میں رہتے تھے۔ اول نمبر کے آوارہ گرد تھے۔ ایک سرخ رنگ کی...... بے چھت جیپ میں گھومتے رہتے تھے۔ جمشیدس کو وہ مختلف ناموں سے پکارتے تھے جن میں ایک نام لالو سائیں بھی تھا۔ اسے یہ نام انہوں نے شاید اس کے لمبے بالوں کی وجہ سے دیا تھا۔ ویسے تو انہوں نے جمشیدس کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا لیکن سرِراہ ملاقات ہونے پر اسے تنگ ضرور کرتے تھے۔ دو چار دفعہ ایسا بھی ہوا تھا کہ انہوں نے جمشیدس کو سڑک کے کنارے اپنی دھن میں مگن جاتے دیکھا۔ وہ جیپ کو برق رفتاری سے اس کی طرف لائے اور منہ سے زوردار آوازیں نکالیں۔ اس کے ساتھ ہی یوں ظاہر کیا کہ وہ اسے کچلنے جا رہے ہیں۔ ایسے میں جمشیدس پھدک کر کسی دکان کے تھڑے پر چڑھ گیا اور وہ جیپ کو اس کے پاس سے لہراتے ہوئے گزر گئے۔ بس یہ ان کی دل لگی تھی۔ جمشیدس کی تلملاہٹ انہیں لطف دیتی تھی۔

منجمد و نیم متحرک شہر میں سے گزرتے ہوئے وہ جلد ہی گلشن اقبال پہنچ گئے۔ یہاں ایک بڑے میوزک سینٹر کے سامنے اکثر مشٹنڈوں کی سرخ جیپ کھڑی نظر آتی تھی۔ دوپہر کے وقت وہ عام طور پر یہیں ہوتے تھے۔ آج وہ یہاں نہیں تھے۔ اسے ان کی خوش قسمتی ہی کہا جا سکتا تھا۔ بہرحال ٹولی کے لیڈر کا ملازم شاپ پر موجود تھا۔ یہ ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا تھا۔ اس نے ''آئی ایم سیکسی'' کے لوگو والی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جمشیدس نے اس کی خوب ٹھکائی کی۔ یہاں تک کہ صدمے اور دہشت سے اس کی پتلون گیلی ہو گئی اور ناک منہ سے خون بہہ نکلا۔ اس بے چارے کو بس یہی لگ رہا ہو گا کہ اس کے سر پر کوئی بجلی چمک رہی ہے جو اسے اٹھا اٹھا کر دیواروں پر مار رہی ہے۔ بند ''گلاس ڈور'' کے سبب کسی کو

معلوم نہیں تھا کہ شاپ کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ لڑکے کی ٹھکائی کے دوران میں جمشید س کی ہدایت پر سالک نے دکان کا ساؤنڈ سسٹم اور ریکارڈنگ مشین وغیرہ برباد کردیں۔ لڑکے کی حالت قابلِ ترس تھی۔ سالک نے جمشید س سے اس کی جان چھڑائی اور وہ دونوں دکان سے باہر نکل آئے۔

''بڑا پسینا آرہا ہے یار...... سارے کپڑے گیلے ہو رہے ہیں۔ پیاس بھی لگ رہی ہے۔'' سالک نے موٹر سائیکل کے عقب میں بیٹھے بیٹھے سرگوشی کی۔

''وہ دیکھو، وہ لڑکا تمہارے لیے بوتل کھول رہا ہے۔'' جمشید س نے کہا۔

ایک پان شاپ پر لڑکے نے ٹھنڈی ٹھار کوک کا ڈھکنا کھولا تھا۔ ڈھکنا ابھی ہوا میں تھا اور بہت آہستہ آہستہ حرکت کررہا تھا۔ اس منجمد لڑکے کے پاس سے گزرتے ہوئے سالک نے آرام سے بوتل چھین لی۔ ایک بغلی سڑک پر لڑکے ٹینس بال سے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ بالر نے تیز رفتار گیند پھینکی تھی۔ بلے باز نے بھی زور سے بلا گھمایا تھا۔ گیند آہستہ آہستہ گھومتی ہوئی بلے کی طرف جارہی تھی۔ یہ بالکل ٹی وی کے سلوموشن اور ایکشن ری پلے جیسا منظر تھا۔ ہوا میں سرکتی ہوئی گیند کو پکڑ کر جمشید س نے بہت دور اچھال دیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ آنے والے لمحے لڑکوں کے لیے یقیناً بہت حیرت ناک رہے ہوں گے۔ انہوں نے بہت عرصے تک سوچا تھا کہ وہ گیند کہاں گئی۔

نہر کے کنارے موٹر سائیکل ایک طرف روک کر وہ درختوں کے نیچے پتھر کے ایک بینچ پر جا بیٹھے۔ ہر منظر ان کے لیے نیا اور دلچسپ تھا۔ جمشید س نے سالک کی نبض پر ہاتھ رکھا اور پوچھا ''طبیعت کیسی ہے؟''

''بالکل ٹھیک۔ بس پسینا زیادہ آرہا ہے؟''

''کوئی بات نہیں۔ نروس سسٹم سمیت ہمارے جسم کا پورا نظام برق رفتاری سے کام کررہا ہے۔ اس لیے معمولی قسم کی تبدیلیاں تو آئیں گی...... سگریٹ پیو گے؟''

سالک نے اثبات میں سر ہلایا۔ اردگرد کوئی نہیں تھا۔ دونوں سگریٹ پینے لگے۔ جمشید س نے کہا ''یہ سگریٹ ہم پانچ منٹ میں ختم کریں گے لیکن درحقیقت یہ صرف دس پندرہ سیکنڈ میں ختم ہوجائے گا اگر کوئی ہمیں دور سے دیکھے تو اسے یہی لگے گا کہ ہم کسی مشینی انسان کی طرح تیز رفتاری سے دھوئیں کے مرغولے نکالتے چلے جارہے ہیں۔ یا پھر اس فلم کی طرح جس میں اسپیڈ کو ''ویری'' کیا جاتا ہے۔''

''یار، مجھے میوزک سینٹر والے لڑکے پر ترس آرہا ہے۔ اسے خوامخواہ مارا ہم نے۔''

''ہمارے ساتھ بھی تو بہت کچھ خوامخواہ ہوتا رہا ہے۔'' جمشید س نے ہاتھ جھٹکا۔

اس نے سگریٹ کے دو تین گہرے کش لیے پھر ایکدم اس کے تاثرات بدلے۔ اس کے ذہن میں جیسے کوئی نئی بات آئی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر ترنگ میں بولا'' چل آ یار! ایک لڑکی کی طرف چلیں۔''

''کون لڑکی؟''

''اندازہ لگا۔''

''تیری گرل فرینڈ اور ہماری بھابی...... مس فرح نذیر۔''

''او نہیں گھامڑ! وہ تو گھڑے کی مچھلی ہے۔ اس کے لیے جال کی کیا ضرورت؟''

''تو پھر کون ہے؟''

''نہر کے پار اس فوارے والے چوک کے ساتھ کس کا گھر ہے۔ کسی مشہور لڑکی کا؟''

سالک نے تھوڑی دیر سوچا پھر بولا ''تم...... ٹی وی اسٹار نابہ کی بات کررہے ہو؟''

''ارے ٹی وی اسٹار کہاں؟ اب تو فلم اسٹار بن گئی ہے۔''

''اچھا تو وہ اب تک دل پر لگی ہوئی ہے۔''

''اوئے، وہ دل سے اترنے والی چیز ہی کہاں ہے۔ ایک دم پٹاخہ ہے۔ ایسی نشیلی شے کو بھولنے کے لیے دو سال تو کیا دس سال بھی ناکافی ہوتے ہیں۔ اس کی باڈی شاڈی کو تو چھوڑ دو اس کے نام ہی کو دیکھو...... نابہ...... نابہ کا تو مطلب ہی ظالم قسم کا نشہ ہے۔ اور پھر یار...... اس سے تھوڑا سا بدلہ بھی تو چکانا ہے۔ اس حرامی ڈائریکٹر کی طرح اس نشیلی ایکٹرس نے بھی تو بے عزتی خراب کی تھی ہماری۔''

''ہماری نہیں۔ صرف تمہاری ہوئی تھی۔ اور میرے خیال میں جمشید س! اس میں قصور تمہارا بھی تو تھا۔ میں چشم دید اور کان شنید گواہ ہوں۔''

''میں نے کیا کیا تھا؟ گالیاں تو اس نے مجھے دی تھیں۔''

''اس نے گالیاں تمہاری بکواس کے جواب میں دی تھیں۔ اور اس بکواس کے وقت تم نے تھوڑی سی بیئر بھی پی رکھی تھی۔''

''پہلے بکواس اس نے کی تھی۔''

''اگر اس نے کی بھی تھی تو اس لیے کہ پچھلے دو مہینے سے

تم نے اس کی دو فون لائنوں پر کوئی چار سو کالیں کی تھیں۔ اس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔" سالک مسکرایا۔

"جو کچھ کیا تھا، فون پر ہی کیا تھا ناں۔"

"اس سے زیادہ کی ہمت بھی نہیں تھی تم میں۔" سالک بڑبڑایا۔

"کیا کہا تم نے؟"

"کچھ نہیں یار! اب چھوڑو اس پرانی بات کو۔"

"یار! میں کون سا اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے جا رہا ہوں۔ بس تھوڑے سے شغل میلے کی بات کر رہا ہوں۔ ذرا دیکھیں گے کہ اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے یہ پری پیکر کس طرح رہتے ہیں۔"

"نہیں جمشید س! میں تو تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

"تو میں اکیلا جاؤں؟"

"یہ بھی ٹھیک نہیں...... لیکن...... لیکن تجھے اتنی جلدی کیا ہے۔ اب یہ "اسم اعظم" تو تیرے ہاتھ آ ہی گیا ہے...... اب کون سا کام تیرے لیے مشکل ہے۔ پھر کسی دن یہ شغل میلہ کر لینا۔"

"تو سمجھ نہیں رہا گھوڑے! ایف ٹو مسکچر بنانے کے لیے ٹائم درکار ہوتا ہے۔ تین قسم کے مادے کے مالیکیول کو توڑنا پڑتا ہے۔ ایٹمی ری ایکٹر کی طرح لمبا پراسس چلتا ہے۔ سمجھو، بھاری پانی تیار ہوتا ہے پھر کہیں جا کر "رفتار کالم" مکمل ہوتا ہے۔ ہم ایف ٹو کا اگلا ڈرنک سات آٹھ ہفتوں سے پہلے نہیں لے سکیں گے اور ممکن ہے کہ زیادہ وقت لگ جائے۔"

"یار! مجھے تو لگتا ہے کہ اب کچھ تھکاوٹ سی ہونے لگی ہے۔ کہیں اثر کم تو نہیں ہو رہا۔"

"اثر کم نہیں ہو رہا، تجھے بھوک لگ گئی ہے۔"

"شاید" سالک نے رسٹ واچ کی طرف دیکھا...... اور چونک گیا۔ جمشید س اسے مسکراتی نظروں سے تک رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" جمشید س نے پوچھا۔

"یار! ہم نے تقریباً پونے بارہ بجے ناشتا فرمایا تھا...... اور اب صرف بارہ بج کر پندرہ منٹ ہوئے ہیں یعنی صرف تیس منٹ میں بھوک؟"

"یہی تو مزے کی بات ہے۔" جمشید س نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا "چل چھوڑ ان باتوں کو۔ اٹھ جا...... وہیں اس پری پیکر کے فریج سے کھانا بھی کھائیں گے۔"

"نہیں بھائی! مجھے تو معاف رکھ۔ میں اس معاملے میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

جمشید س تھوڑی دیر اسے گھورتا رہا۔ آخر لمبی سانس لے کر بولا "چل ٹھیک ہے، تو نہ جا تو بس اتنا کرنا کہ فوارے والے چوک میں درختوں کے نیچے بیٹھ جانا۔ وہاں سے اس جل پری کی کوٹھی کا گیٹ نظر آتا رہے گا۔ اگر تو کسی طرح کی گڑبڑ محسوس کرے تو مجھے موبائل پر کال کر لینا۔"

وہ کچھ دیر تک سالک کو سمجھاتا رہا پھر اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر فوارے والے چوک پہنچ گیا۔ یہاں اِکا دُکا افراد موجود تھے۔ جمشید س نے موٹر سائیکل چوک میں رکھے اور ایک پتھریلے بینچ کے بالکل پاس روک دی۔ مقصد یہی تھا کہ سالک کو موٹر سائیکل سے اتر کر زیادہ چلنا نہ پڑے...... لوگوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ اپنی دیگر حرکات و سکنات کو تو سست کر لیتے تھے لیکن سلو موشن کے انداز میں چلنا ممکن نہیں تھا۔ لوگ انہیں چلتا دیکھ کر چونک جاتے تھے۔

سالک نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "دوپہر ہو چکی ہے۔ کیا وہ تیری فلمسٹار اس وقت گھر میں ہوگی؟"

"ان لوگوں کی شام، رات کے پچھلے پہر ہوتی ہے۔ اس وقت وہ سکون سے سو رہی ہوگی۔"

"دیکھ یار! کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا۔ مجھے تجھ سے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"کس بات کا ڈر؟"

"کسی کام میں بھی زیادتی اچھی نہیں ہوتی۔ میرا تو خیال ہے۔ اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ ہمارے حساب سے ہمیں گھر سے نکلے ہوئے تقریباً چار پانچ گھنٹے ہونے والے ہیں۔"

"اور حقیقت میں صرف تیس منٹ۔ چل پانچ دس منٹ اور سہی۔" جمشید س نے اپنی بائیں آنکھ دبائی اور اس کے ساتھ ہی پتلون کی جیب تھپتھپا کر اس میں چاقو کی موجودگی کا یقین کیا۔

کالے رنگ کی ایک چھوٹی چڑیا ان کے سر پر سے گزر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہاتھ بلند کر کے بہ آسانی اسے دبوچ سکتے ہیں۔ جمشید س نے اسے "بائی" کہا اور موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ نیم متحرک ٹریفک کے درمیان سے وہ برق رفتاری کے ساتھ گزرتا ہوا فلمسٹار نابہ کی کوٹھی کے عقب میں گم ہو گیا۔ سالک نے درخت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تھے۔ پیشاب بھی آ رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ صرف تیس منٹ پہلے گھر سے چلتے وقت اس نے اپنا مثانہ پوری طرح خالی کیا تھا۔ یہ

سب الیف ٹو کے کرشمے تھے۔

اس کے سیل فون کی بیل ہوئی، بڑی عجیب پھٹی پھٹی سی آواز والی بیل تھی، اس نے بڑی آہستگی کے ساتھ فون نکال کر کان سے لگایا اور کال ریسیو کی۔ پتا نہیں کون بول رہا تھا۔ وہی صدا تھی جو گراموفون کی چابی ختم ہونے پر ریکارڈ ڈسک سے آتی ہے...... بھرائی ہوئی، بھاری بھرکم اور ناقابلِ فہم۔ اس کے اردگرد بس اسی طرح کی صدائیں تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ''شہر لاہور'' ایک گراموفون ہے اور اس کی چابی ختم ہوگئی ہے۔ صرف جمشید اور وہ ایک دوسرے کی آوازیں درست طور پر سن سکتے تھے۔

درخت سے ٹیک لگائے لگائے اسے اونگھ آنے لگی۔

اپنے حساب سے وہ شاید ایک گھنٹے تک بیداری اور نیم بیداری کی کیفیت میں رہا لیکن حقیقت میں یہ تین چار منٹ کا وقفہ تھا...... دور ایک سی این جی اسٹیشن پر ابھی وہی ٹویاٹا کار گیس بھروا رہی تھی جو ان کے یہاں آتے وقت کھڑی تھی۔

سالک بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ جمشید کے آنے میں جوں جوں دیر ہورہی تھی، سالک کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے سالک کو اچانک ایک عجیب احساس ہوا۔ اسے لگا کر چوک کے اردگرد رینگتی ہوئی گاڑیوں میں کچھ تیزی آگئی ہے۔ ان کے سائیلنسروں اور ہارنوں سے پیدا ہونے والی آوازیں بھی قدرے مختلف ہوگئی تھیں۔ سامنے ایک پرائیویٹ اسکول کی بلڈنگ پر ایستادہ رنگ برنگے جھنڈے جو پہلے ہوا میں معلق اور ساکت دکھائی دیتے تھے، اب ہولے ہولے حرکت کررہے تھے۔ ایک مالی اپنا ''گراس کٹر'' کھینچتا ہوا اس کے سامنے سے گزرا...... وہ پہلے بھی دو تین مرتبہ گزرا تھا۔ اس کی رفتار اب بھی کم تھی لیکن پہلے سے زیادہ تھی۔

''تو کیا...... ڈرنک کا اثر ختم ہورہا ہے؟'' اس نے خود سے پوچھا۔

یقیناً ایسا ہی تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گراموفون میں پھر چابی بھرتی جارہی ہے۔ اوہ خدایا...... یہ جمشید کہاں مر گیا ہے۔ بے شک وہ ایک ہوشیار، ذہین بلکہ جینئیس شخص تھا۔ لیکن بڑی بڑی غلطیاں بھی تو جینئیس لوگوں سے ہی ہوتی ہیں۔ الیف ٹو کے حوصلہ افزا اثرات نے جمشید میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی پیدا کردی تھی۔ اس حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی میں وہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ کردے۔

سالک کی نگاہیں بار بار فلمسٹار نابہ کی کوٹھی کے گیٹ کی طرف اٹھنے لگیں۔ اندر مکمل سکوت تھا۔

قریباً ایک گھنٹا مزید اسی گومگو کی کیفیت میں گزرا پھر سالک کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ اس نے جمشید کو واپس آتے دیکھا۔ جمشید نے موٹر سائیکل اس کے بالکل قریب کھڑی کی۔ سالک کو جمشید کے چہرے پر جو سب سے پہلی شے نظر آئی...... وہ لپ اسٹک کے داغ اور پسینے کے قطرے تھے۔ جمشید کا گریبان کھلا تھا۔ بال بکھرے بکھرے اور آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تھی۔ پھر سالک کی نگاہ ایک اور نشان پر پڑی اور وہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ جمشید کی گردن پر ناخنوں کی چند نمایاں خراشیں دکھائی دے رہی تھیں۔

اس نے سر پر ہیلمٹ رکھا اور جمشید کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ ''مجھے تجھ سے یہی ڈر تھا کہ تو کوئی نہ کوئی گل کھلائے گا۔'' اس نے جمشید کے کان میں کہا۔

جمشید خاموش رہا۔ اس کی خاموشی اس کے بہک جانے کا اعتراف تھی...... گناہ کی ملامت اس کے چہرے پر ہی نہیں سارے سراپا پر دکھائی دیتی تھی۔ موٹر سائیکل چلتی رہی۔ دونوں خاموش رہے۔ ان کے اردگرد موجود ٹریفک بتدریج متحرک اور رواں ہوتی جارہی تھی۔ تمام زندہ اور بے جان اشیاء کی حرکات، معمول کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کچھ یہی حال آوازوں کا تھا...... انجنوں کی گھرر گھرر اور ہارنوں کی پی پی اور گھوڑے کے سموں کی ٹپ ٹپ...... سب کچھ اب قابلِ شناخت ہوتا جارہا تھا۔

''ہاں کیا کارنامہ انجام دیا ہے؟'' سالک نے پیچھے بیٹھے بیٹھے اسے پھر ٹہوکا دیا۔

''بس چھوڑ یار! جو ہونا تھا ہوگیا۔ اصل میں جب لڑکی مزاحمت نہ کرے اور دہشت سے پتھرا جائے تو پھر بندہ کیا کرے۔ اگر وہ تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں چلاتی، مزاحمت کرتی تو شاید بات چھیڑ چھاڑ تک ہی رہتی۔ لیکن جب وہ سرنڈر ہی کرگئی تو پھر...... بس ایک گارڈ تھا اس کے روم سے باہر۔ وہ بھی اپنی میڈم جی کو مشکل میں دیکھ کر بھاگ لیا۔ ایسے لوگوں کے گارڈ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مطلب پرست۔ روزانہ تین تین کلو مٹن کڑاہی کھا جاتے ہیں اور جب نمک حلالی کا موقع آتا ہے تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے ہیں۔''

اس نے چند لمحے توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''چل چھوڑ دفع کر یار! یہ کون سی سچی فن کارا تھی۔ جسم کی کمائی کھا رہی ہے۔ ایسے لوگوں کا کچھ بگڑتا وگڑتا نہیں ہے۔''

''کچھ بھی ہے۔ یہ بہت برا کیا ہے تو نے۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں، کوئی نشہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔''

''اوئے کھوتے! یہ نشہ نہیں ہے۔ یہ انقلاب ہے

تہلکہ مچا دے گا۔ خود پر فخر کر کہ تو ایک ایسے شخص کا
انقلاب ہے جس کی کھوپڑی میں اس وقت کیمیا کی تاریخ کا حیرت
انگیز ترین فارمولہ موجود ہے......'' جمشیدس غصے سے بولا اور
کافی دیر تک بولتا رہا...... سالک نے دیکھا، ان کے اردگرد
ٹریفک اب معمول کے مطابق تھی۔ آوازیں بھی بالکل
درست تھیں۔ موبل آئل والے دھوئیں کی بو بھی پرفیکٹ
تھی۔ سالک کو اپنا سر بھاری لگ رہا تھا۔ معدے میں بھی
گرانی سی تھی۔ ''میرا خیال ہے تمہاری ڈرنک کا اثر زیرو
ہو چکا ہے۔'' سالک نے کہا۔
جمشیدس نے موٹر سائیکل چلاتے چلاتے اثبات میں
سر ہلایا۔
''اب جلد از جلد گھر پہنچنا چاہیے۔''
''لیکن سب سے پہلے اس موٹر سائیکل سے چھٹکارا
پالیں۔ اس پر گھومنا خطرناک ہے۔'' جمشیدس نے کہا۔
جس دوست سے موٹر سائیکل مستعار لی گئی تھی اس کا
گھر نزدیک ہی تھا۔ پروگرام کے مطابق انہوں نے موٹر
سائیکل اور دونوں ہیلمٹ گھر کے گیٹ پر موجود چوکیدار کے
حوالے کر دیا اور چابی بھی اسے دے دی۔
موٹر سائیکل سے چھٹکارا پانے کے بعد انہوں نے خود
کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ یہاں سے جمشیدس کا فلیٹ
تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر تھا۔ اندرونی گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ
یہ فاصلہ بہ آسانی طے کر سکتے تھے۔ چلتے چلتے سالک نے یونہی
اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی ملائم شیو تقریباً ایک گھنٹے میں
ہی کھردری ہو گئی تھی بلکہ خاصی کھردری۔ وہ ابھی تھوڑی دور
ہی گئے تھے کہ سالک بولا ''یار! ایک دم تھک گیا ہوں۔ تھوڑی
دیر کہیں بیٹھ نہ جائیں؟''
جمشیدس کے چہرے پر بھی نقاہت دکھائی دیتی تھی۔
دونوں نے ایک قریبی پان شاپ سے ڈسپوزیبل کولڈ ڈرنک
لیے اور ساتھ ہی چلڈرن پارک کی ٹھنڈی گھاس پر بیٹھ گئے۔
سالک نے چور نظروں سے جمشیدس کا چہرہ دیکھا۔ وہ مسرور و
مطمئن نظر آتا تھا۔ آج اس نے چند گھنٹوں کے اندر اپنے کئی
دیرینہ ارمان نکالے تھے...... اور آخر میں تو حد سے ہی گزر گیا
تھا۔

ایک دم جمشیدس کچھ چونکا چونکا نظر آنے لگا۔ پہلے تو
سالک کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا...... پھر اپنے اردگرد دیکھ کر اسے
بھی جھٹکا سا لگا۔ پارک میں فٹ بال کھیلتے ہوئے بچے معمول
سے زیادہ تیز رفتار دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے فلم تیز چلا دی
گئی ہو۔ سالک نے قریبی گلی سے گزرتے ہوئے دو موٹر
سائیکل سواروں کو دیکھا۔ وہ بھی برق رفتاری سے گزر گئے۔
ایک بھک منگے نے قریب سے صدا لگائی تو اس کے الفاظ
آپس میں گڈمڈ ہو گئے اور ان دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔
''اوہ گاڈ۔'' جمشیدس نے ہولے سے کہا اور اپنے
ہونٹ سکوڑے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے جمشیدس! یہ سب کچھ الٹ ہو رہا
ہے......''

جمشیدس کچھ دیر تک جبڑے بھینچے بیٹھا رہا۔ پھر
سرسراتے لہجے میں بولا ''ہماری الیف ٹو کا اثر زیرو سے نیچے چلا
گیا۔ یعنی مائینس ہو گیا ہے۔ مائینس ٹو، مائینس فور یا
فائیو۔''

فٹ بال تیزی سے اڑتی ہوئی ان کی طرف آئی۔
سالک نے خود کو اس سے بچانا چاہا لیکن وہ اس کے ہاتھ پر
لگی۔ کولڈ ڈرنک کی بوتل اس کے ہاتھ سے نکل کر دور
جا گری۔ وہ ٹپٹا کر رہ گیا۔
''یہ کیا ہو رہا ہے یار، کیا تمہیں...... کیا تمہیں پہلے پتا
نہیں تھا۔'' سالک نے پوچھا۔
''نن...... نہیں۔ پہلے تو ایسا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ اثر
ختم ہونے پر سر ضرور بھاری ہوتا تھا۔ کسی وقت ایک دو چکر بھی
آتے تھے۔ میں سو جاتا تھا۔ اٹھتا تھا تو طبیعت بالکل بحال
ہوتی تھی......'' جمشیدس کا نچلا جبڑا لٹکا لٹکا تھا۔
ان کے اردگرد موجود زندہ و بے جان اشیا کی رفتار
آہستہ آہستہ لیکن بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ کیمیائی ڈرنک
کا ''ریورس ایکشن'' تھا اور بہت ڈرا دینے والا تھا۔
سالک نے اپنے پاؤں کو اوپر نیچے حرکت دی اور پُر
سوچ لہجے میں بولا ''مجھے تو لگتا ہے کہ ہماری
GRAVITY پر بھی اثر پڑا ہے۔ پہلے ''گریوٹی'' زیادہ
ہو گئی تھی، اب شاید کم ہو گئی ہے۔''
''مجھے بھی لگ رہا ہے۔ یہ کولڈ ڈرنک کی بوتل دیکھو۔''
جمشیدس نے بوتل اسے تھمائی...... یہ معمول سے کہیں زیادہ
وزنی لگ رہی تھی۔
''یعنی ہماری گریوٹی کم ہوئی ہے لہٰذا چیزیں وزنی
لگ رہی ہیں۔''
''بالکل یہی ہے۔'' جمشیدس نے اثبات میں سر ہلایا۔
ایک بہت موٹا شخص بڑی برق رفتاری سے چلتا ان
کے عقب سے گزر گیا۔ جمشیدس نے خود کو سنبھالتے ہوئے
کہا ''زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہمارے
جسمانی نظام کی ''غیر معمولی کوشش'' کا ردعمل ہے۔ ردعمل کے

طور پر جسمانی نظام اور نروس سسٹم وغیرہ معمول کی رفتار سے بھی پیچھے چلے گئے ہیں۔ لیکن یہ کیفیت عارضی ہے۔ تھوڑی دیر میں ختم ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ ہم کسی آرام دہ جگہ پر ایک گھنٹے کی پُرسکون نیند لے لیں تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''وہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن......یار جمشید س! میری ایک بات مان لے۔ میرا دل کہتا ہے یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح کی ہیجانی خوشیاں اور لذتیں زیادہ دیر پا نہیں ہوتیں۔ جب بندہ ان کے سحر سے نکلتا ہے تو بہت پیچھے چلا جاتا ہے۔ فطرت کے مطابق، اعتدال سے چلتے رہنے میں ہی سچی راحت ہے۔ دیکھ اب ہمارے ڈرنک کا جادو ٹوٹا ہے تو دماغ پر کتنا بوجھ پڑ گیا ہے۔''

''تو بڑا ڈفر ہے گھوڑے! یار تجھے احساس ہی نہیں ہے کہ یہ کتنی بڑی ACHIEVEMENT ہے۔ لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹ جائیں گی۔ دیوانے ہو جائیں گے......'' جمشید س نے پھر ایک لمبا لیکچر اپنے تیار کردہ اس حیرت انگیز کیمیائی محلول پر دے دیا۔

سالک بیزاری سے سنتا رہا۔ پھر اس لیکچر کے دوران ہی وہ اپنے بازوؤں کا سرہانہ بنا کر ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سو چکا تھا۔ سونا تو جمشید س بھی چاہتا تھا لیکن گھر جا کر۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ سالک کو جگائے یا اکیلا ہی اٹھ کر گھر کو چل دے کہ اس کے سیل فون پر SMS موصول ہوا۔ اس نے دیکھا...... یہ فرح کی طرف سے تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''پیارے سائنٹسٹ! اس دفعہ پھر بھول گئے ہو۔ آج تمہاری سالگرہ ہے۔ کیک لے کر تمہارے فلیٹ کے بند دروازے کے سامنے کھڑی ہوں۔ کہاں ہو۔ جلدی سے آجاؤ۔''

''او کے آرہا ہوں۔'' اس نے لکھا۔

یہ ایک نجی ملاقات تھی۔ اس نے سالک کو وہیں درخت کی چھاؤں میں سونے دیا اور خود اٹھ کر فلیٹ کی طرف چل دیا۔ پندرہ بیس قدم چل کر اسے اندازہ ہوا کہ اس حالت میں قدم اٹھانا بہت دشوار ہے۔ پاؤں جیسے اٹھ ہی نہیں رہے تھے۔ ٹانگیں بے جان تھیں۔ اس کے اردگرد ہر شے نہایت تیز رفتار اور متحرک ہو چکی تھی۔ وہ اپنے طور پر نارمل انداز میں چل رہا تھا۔ تاہم اسے معلوم تھا کہ اردگرد موجود لوگ اسے اور ڈھنگ سے دیکھ رہے ہوں گے۔ انہیں وہ سلوموشن میں چلتا نظر آتا ہوگا۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔ اس نے اپنے قریب تیز تیز گزرتے ہوئے ایک معمر جوڑے کی آنکھوں میں عجیب حیرت دیکھی۔ پھر اس نیلی سڑک پر دو سائیکل سوار بچے فراٹے سے گزرے اور اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں بھی حیرت کی یلغار ہوئی۔ وہ فٹ پاتھ پر ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوچا اسے کسی رکشے میں سوار ہو جانا چاہیے...... اپنے فلیٹ تک کا فاصلہ اسے بہت...... بہت طویل لگ رہا تھا۔ اور پھر یہ بھی تھا کہ وہ لوگوں کی حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اسے اپنے گلے پر جلن کا احساس ہوا۔ یہاں فلمسٹار نابہ کے ناخنوں نے کھرونچ ڈالا تھا۔ اس نے گریبان کا بالائی بٹن احتیاط سے بند کر لیا۔ (فرح کی نگاہ اس کھرونچے پر نہیں پڑنی چاہیے تھی) اس نے تصور کی نگاہ سے دیکھا، سرو قد فرح کیک کا ڈبہ لیے اس کے فلیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے شہد رنگ بالوں کی لٹیں اس کے دائیں رخسار پر جھول رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں اس کا تصور اسے اچھا لگا۔ وہ اس کا کتنا خیال رکھتی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ جلدی فلیٹ تک پہنچ جائے۔ لیکن راستے اچانک ہی بہت لمبے اور قدم بہت سست محسوس ہونے لگے تھے۔ پتا نہیں کیوں اپنے اردگرد کی برق رفتاری سے اسے ڈر لگنے لگا تھا۔

رکشا دکھائی نہیں دیا تو اس نے ایک بار پھر پیدل چلنے کی ٹھانی۔ ابھی وہ سوچ بھی ہی رہا تھا کہ پیدل چلے یا نہیں کہ اسے دور سڑک کے آخری سرے پر سرخ جیپ نظر آئی۔ اس پر مشٹنڈے سوار تھے۔ جیپ درمیانی رفتار سے آرہی تھی......ابھی وہ جمشید س سے پچاس ساٹھ میٹر دور ہی تھی کہ رک گئی۔ غالباً مشٹنڈوں نے جمشید س کو دیکھ لیا تھا۔ شاید اب ان پر شرارت کا موڈ سوار ہو رہا تھا۔ چند سیکنڈ تک رکے رہنے کے بعد جیپ کے پہیے چرچرائے اور وہ برق رفتاری سے آگے بڑھی۔ مشٹنڈوں کی ٹولی نے حسبِ معمول پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے شور مچایا۔ جیپ نے درمیانی فاصلہ پلک جھپکتے میں طے کیا اور جمشید س پر چڑھ دوڑی......لڑکے جانتے تھے کہ لالو سائیں عین وقت پر پھدک کر ان کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ لیکن وہ نہیں ہٹا۔ وہ ہٹ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ معکوس رفتار کے نرغے میں تھا۔ آخری ساعت میں ڈرائیونگ کرنے والے لڑکے نے پورے زور سے بریک پیڈل دبانے کی کوشش کی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ جیپ نے جب جمشید س کو ہوا میں اٹھا کر بہت طاقت سے پختہ دیوار پر مارا تو لڑکوں کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ دیوار سے ٹکراتے ہی جمشید س کی ''بیش قیمت'' کھوپڑی ٹوٹ گئی تھی۔